قابل اجمیری ...... ایک جواں مرگ شاعر

وحید الرحمٰن خان☆

قابل اجمیری کا اصل نام عبدالرحیم تھا۔ وہ 27 اگست 1931ء کو ہندوستان کے صوبے راجستھان کے ضلع اجمیر کے ایک قصبے چرلی میں پیدا ہوئے۔ قابل اجمیری نے دارالعلوم معینیہ عثمانیہ، اجمیر میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور وسائل کی تنگی کے باعث مدرسے کے ثانوی درجے سے آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ چودہ برس کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ ابتداء میں شاہ عبدالرحیم ارمان اجمیری سے اصلاحِ سخن لی اور بعدازاں مولانا معنی اجمیری کے شاگرد ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کرکے حیدرآباد آ گئے۔ تمام زندگی غمِ روزگار کا شکار رہے۔ عرضی نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ صحافت سے بھی منسلک رہے۔ ابھی ان کی عمر اٹھارہ برس تھی کہ دق کے جان لیوا عارضے میں مبتلا ہو گئے۔ علاج کے لئے کوئٹہ کے ریلوے سینی ٹوریم میں داخل ہوئے۔ وہیں ان کی ملاقات عیسائی نرس نرگس سوسن سے ہوئی۔ یہ ملاقات محبت کا روپ اختیار کر گئی۔ نرگس صاحبہ نے اسلام قبول کیا اور یکم اپریل 1960ء کو دونوں کی شادی ہوئی۔ 3 اکتوبر 1961ء کو ان کا بیٹا (ظفر قابل) پیدا ہوا۔ اگلے برس بیٹے کی سالگرہ کے دن، قابل اجمیری کا انتقال ہو گیا۔ دیکھا اس ''بیماریٔ دق'' نے آخر کام تمام کیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر محض اکتیس برس تھی۔ انہیں حیدرآباد کے ایک قبرستان میں دفن کیا گیا۔

محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ:

''ایک دن سودا مشاعرے میں بیٹھے تھے۔ لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھ رہے تھے۔ ایک شریف زادے کی 12-13 برس کی عمر تھی، اس نے غزل پڑھی، مطلع تھا:

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

☆ ریسرچ آفیسر اقبالیات، جامعہ پنجاب، لاہور

گرمئی کلام پر سودا بھی چونک پڑے پوچھا : یہ مطلع کس نے پڑھا؟ لوگوں نے کہا، حضرت یہ صاحبزادہ ہے۔ سودا نے بھی بہت تعریف کی۔ کئی مرتبہ پڑھوایا اور کہا کہ میاں لڑکے جوان تو ہوتے نظر نہیں آتے۔ خدا کی قدرت، انہی دنوں میں لڑکا جل کر مرگیا۔'' (1)

یہ گم نام شاعر اُردو کا پہلا (کم عمر ترین) جواں مرگ شاعر تھا جس کا شعر اس کی وفات کے بعد آج بھی زندہ اور زبان زدعام ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں ایسے کچھ سخن ور اور بھی ہیں جو خود تو شعلۂ مستعجل ثابت ہوئے لیکن ان کی شاعری کا چراغ آج بھی روشن ہے۔ خاص طور پر دو نام قابل ذکر ہیں کہ ان کا شعری سرمایہ معیار کے ساتھ ساتھ مقدار کے اعتبار سے بھی تسلی بخش ہے۔ ان میں سے ایک شکیب جلالی ہیں کہ جن کے نام اور کلام سے اُردو دان طبقہ بخوبی واقف ہے، دوسرے قابل اجمیری ہیں جو ادبی دُنیا میں نسبتاً کم معروف ہیں۔ ذیل کی سطور میں اہلِ ذوق کی دلچسپی کے لئے اس جوہرِ قابل کی شاعری کا ایک تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

قابل اجمیری ایک خوش فکر اور نغز گو شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی پہچان کا بنیادی حوالہ غزل ہے۔ انہوں نے یوں تو دیگر اصنافِ سخن مثلاً نظم، رباعی قطعہ وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی، لیکن ان کے جوہر غزل ہی میں کھلتے ہیں۔ غزل قابل کی پہلی محبت ہے۔ وہ اول و آخر غزل کے شاعر ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مزاج اور طبع کو غزل کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے۔ قابل کے ہاں روایت کا گہرا شعور ملتا ہے۔ انہوں نے کلاسیکی شاعری کا بغور مطالعہ کیا اور اسے حرز جاں بنالیا۔ وہ غزل کے مزاج آشنا تھے، ان کے ہاں روایتی مضامین بھی ہیں، لیکن انہوں نے اپنی جدت طبع سے کام لیتے ہوئے روایت میں اضافہ بھی کیا۔ ان کی شاعری میں روایت پس منظر کا کام کرتی ہے۔ فرمان فتح پوری کے بقول :

> ''قابل اجمیری میں نکتہ سے نکتہ پیدا کرلینے، خیال روشن کرلینے اور روایت سے تازہ روایت کو جنم دینے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ ان

کی طبیعت میں بلا کی جدت و لطافت اور ان کے احساس میں غضب کی تازگی و انفرادیت ہے۔'' (2)

عبادت بریلوی نے یہی بات قدرے وضاحت سے کہی ہے:

''وہ لکیر کے فقیر نہیں۔ ان کے یہاں تقلید کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ نئی بات کہتے ہیں اور نئے انداز میں کہتے ہیں۔ وہ نئے رجحانات سے آشنا ہیں۔ انہیں رجحانات کی اہمیت کا احساس ہے۔ وہ غزل کی صنف کو وسیع کرنے کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان کے کلام میں وسعت اور پھیلاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ جدت اور اپج نظر آتی ہے۔ بدلتی ہوئی زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کے میلانات نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔'' (3)

قابل نے روایت سے خاطر خواہ اکتساب کیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ جدت کی طرف بھی توجہ دی۔ انہوں نے پرانے موضوعات کو خوبی سے ادا کیا، تاہم وہ ہمہ وقت نئے مضامین اور تازہ خیالات کی جستجو میں رہتے تھے۔ قابل سخن گوئی میں تقلید کے قائل نہیں، بلکہ اپنی دُنیا آپ پیدا کرنے کے آرزو مند ہیں۔ اگرچہ وہ اکثر و بیشتر قدیم موضوعات کی بنیاد پر اپنی شاعری کا محل تعمیر کرتے ہیں، تاہم جدید رجحانات سے بھی غافل نہیں رہتے۔ وہ نئے رجحانات اور تازہ امکانات سے اس محل کی آرائش و زیبائش کا کام لیتے ہیں۔ وہ غزل کی صنف کو وسیع کرنے کے خواہاں تھے، اس لئے ان کے ہاں وسعت اور کشادگی کا خوشگوار احساس ملتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کے مطابق: ''دوشیزۂ غزل نے اپنے سب اسرار اس پر کھول دیئے تھے۔'' (4)

دوشیزۂ غزل کا سب سے اہم ''راز'' حسن و عشق ہے۔ قابل اجمیری نے معاملاتِ حسن و عشق کو نفسیاتی بصیرت اور ذاتی تجربات کی روشنی میں ادا کیا ہے۔ محبت کے تجربے نے

ان کی شاعری میں سوز وگداز کی کیفیت پیدا کردی ہے، ان کی غزل میں عشق کی کیفیات اور احساسات روایتی طور پر بیان نہیں ہوئے بلکہ اس کے پس منظر میں ایک خالص عشقیہ تجربہ موجود ہے۔ اس جذباتی واردات کے باعث ان کے یہاں شدتِ احساس اور جذبہ کی گہرائی نظر آتی ہے۔ قابل ان الفاظ میں اقرارِ محبت کرتے ہیں۔

حدیثِ کاکل و رخسار ہم بھی رکھتے ہیں
کوئی سنے تو غمِ یار ہم بھی رکھتے ہیں

ہمیں بھی شہر نگاراں میں لے چلو، یارو
کسی کے عشق کا آزار ہم بھی رکھتے ہیں

قابل کے نزدیک عشق لازمۂ حیات ہے۔ محبت کے بغیر انسان کی زندگی بے کیف اور بے رونق ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو زندگی کو زندگی کے راز سکھلاتا ہے اور اِنسان پر زندگی کا مفہوم عیاں کرتا ہے۔ قابل انسانی حیات میں محبت کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

قابل کی غزل میں عشق کا ایک تہذیب یافتہ تصور نظر آتا ہے۔ یہ ایک شائستہ اور مہذب انسان کا عشق ہے، جس میں سطحیت اور ابتذال کا عنصر بالکل نہیں ہے، جن کیفیات و واردات کو انہوں نے شاعری کا موضوع بنایا ہے، وہ ایک متوازن اور باشعور فرد کی کیفیات و واردات ہیں۔ بنیش سلیمی کے الفاظ میں :

''تہذیب و شائستگی، ظرف و ضبط، توانائی اور توازن کی ایک عجیب دلکش اور پر تاثیر فضا ان کے کلام میں پائی جاتی ہے، جس میں ابتذال، سطحیت اور تقلید کا شائبہ تک نہیں۔ (5)

ذیل میں نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں :

نظر نظر میں ہے کامرانی، قدم قدم پر ہے کامیابی
مگر کوئی مسکرا کے دیکھے تو ہار جانا بھی جانتا ہوں

حیرتوں کے سلسلے سوزِ نہاں تک آگئے
ہم نظر تک چاہتے تھے تم تو جاں تک آگئے

کسی کی زلف پریشاں، کسی کا دامن چاک
جنوں کو لوگ تماشا بنائے پھرتے ہیں

آخری شعر میں قابل نے معنی خیز انداز میں زلفِ پریشاں اور چاک گریباں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ اس طرز کا مضمون اُردو شاعری میں کہیں بیان نہیں ہوا۔ اس شعر پر فرمان صاحب کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

''علامہ اقبال نے ایک فارسی شعر میں البتہ کہا تھا:

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

بہت ممکن ہے قابل اجمیری کی نظر سے یہ شعر گزرا ہو اور دیوانگی بشرطِ فرزانگی کا خیال انہوں نے یہیں سے لیا ہو، لیکن انہوں نے جس سادگی، دلکشی اور طنزیہ لہجے میں اس خیال کو ایک نیا رُخ دے دیا ہے، وہ کم از کم اُردو شاعری میں بالکل نئی چیز ہے۔ مجھے یقین ہے یہ شعر اپنی برجستگی، شگفتگی اور معنوی جدت کے سبب بہت جلد ضرب المثل بن جائے گا اور اس کا نفس مضمون یا تاثر جو سردست بغاوت کی حیثیت رکھتا ہے، غزل میں ایک نئی روایت کو جنم دے گا''۔(6)

قابل کی شاعری کا سب سے نمایاں پہلو عشق اور اس کی جملہ کیفیات و احساسات کا

نفسیاتی تجزیہ ہے۔ وہ دلکش آہنگ میں عاشق کی ''تحلیل نفسی'' کرتے ہیں اور دل پر گزرنے والی حالتوں کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق ایسی ''پیاس'' ہے جس کا مداوا زہر بھی نہیں کرسکتا۔ وہ محبت میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، چنانچہ محبوب کو بھی محبت سے کم کم دیکھتے ہیں۔ قابل کے خیال میں اگر نگاہِ دوست پہ اظہار بیکسی ہوجائے تو جذبۂ محبت فنا ہوجاتا ہے۔ وہ جنوں کے تماشا بنانے کو زمانہ سازی سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مقام عاشقی چاک گریبانی اور پریشانی زلف سے ماورا ہے۔ قابل کے نزدیک محبت دردِ سر نہیں بلکہ یہ زندگی بسر کرنے کا ایک منشور ہے۔

محبت کی حقیقت کھل گئی چاکِ گریباں سے
جنوں بھی ایک منزل میں زمانہ ساز ہوتا ہے

آنکھوں میں فقط آنسو، ہونٹوں پہ فقط آہیں
اندازِ جنوں دل کو اب تک نہیں آیا ہے

دل رسم و رہِ شوق سے مانوس تو ہولے
تکمیل تمنا کے لئے عمر پڑی ہے

قابل وارداتِ قلبی کی مختلف صورتیں نفسیاتی بصیرت اور عمیق مشاہدے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کا فلسفۂ عشق منفرد انداز کا حامل ہے۔ وہ عشق کو نئے تیور دینے کے لئے محبوب سے بھی گریزاں ہوجاتے ہیں۔ قابل کے عشق میں طرزِ دلربائی اور اندازِ محبوبیت پایا جاتا ہے، وہ محبت میں انا اور خودداری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

پیغامِ حضوری نہیں آیا تو نہ آئے
ہم سے بھی طوافِ در جاناں تو نہ ہوگا

انانیت کا یہ گہرا احساس غالب کی یاد دلاتا ہے۔ دراصل قابل روایت کے بطن سے تازہ امکانات پیدا کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ اپنی روشنیٔ طبع کی مدد سے چراغ سے

چراغ روشن کر لیتے تھے۔ غالب نے کہا تھا:

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

قابل اس خیال کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں۔

رکا رکا سا تبسم، جھکی جھکی سی نظر
تمہیں سلیقۂ بیگانگی کہاں ہے ابھی

قابل اجمیری معاملاتِ حسن وعشق کو ایک ماہرِ نفسیات کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ ایک طرف عشق کی کیفیات و واردات کو موضوعِ سخن بناتے ہیں تو دوسری طرف محبوب کی ذہنی کشمکش سے بھی لاتعلق نہیں رہتے۔ زندگی کے مسائل کی طرح حسن کی بعض کیفیات کا انہوں نے گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ ''قابل نے حسن کے بعض ایسے پہلوؤں پر نگاہ ڈالی ہے جس کی طرف شاید اس انداز سے کسی نے دیکھا نہیں اور اگر دیکھا بھی تو اس برجستگی اور اثر آفرینی کے ساتھ رقم نہیں کیا۔'' (7)

جذبہ عشق کے ہاتھوں محبوب کے دل پر گزرنے والی متغیر اور متنوع کیفیات واحساسات کو قابل خوب سمجھتے ہیں۔ وہ حسن کے مزاج شناس ہیں۔ قابل کے تصورِ محبوب میں ایک بانکپن موجود ہے۔ یہ تصور بیک وقت روایت سے بھی منسلک ہے اوراس میں جدت کی شان بھی پائی جاتی ہے۔ قابل محبوب کے خارجی حسن کا نقشہ نہیں کھینچتے اور نہ ہی جمالِ محبوب کے مختلف مظاہر کو بیان کرتے ہیں۔ وہ محبوب کے پیکر کے خطوط کی طرف توجہ نہیں دیتے بلکہ حسن کی اداؤں، ناز و انداز اور مزاج کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

بے نیازی کو اپنی خو نہ بنا
یہ ادا بھی کسی کو پیاری ہے

ہو کے رہ جاتا ہے اپنی ہی اداؤں میں اسیر
حسن شائستہ اربابِ نظر ہونے تک

ان کے حسنِ ستم کا کیا کہنا
لوگ سمجھے خطا ہماری ہے

قابل کے ہاں یکطرفہ محبت کا تصور نہیں بلکہ ان کا محبوب چپکے چپکے دل ہی دل میں اپنے عاشق کے لئے انسیت کا جذبہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ عاشق کی جرأتِ اظہار پہ خفا بھی ہوتا ہے، لیکن اپنی جفاؤں پر ندامت کا احساس بھی اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ محبوب عاشق کی حالتِ زار کے باعث پریشان اور پشیمان رہتا ہے اور اپنے چاہنے والے کے لئے دل میں جذبۂ ہمدردی رکھتا ہے۔

نگاہِ یار برہم ہوتے ہوتے
مزاج گلستاں ہوجائے گی کیا

مرے جنوں کا تماشا تو سب نے دیکھ لیا
تری نگاہِ پشیماں کی بات کون کرے

اس کے جلوے بھی پشیمان ہوئے جاتے ہیں
دوستو، حسرتِ دیدار پہ کیا گزری ہے

نئی نئی ہے محبت، نیا نیا ہے خلوص
سنبھل سنبھل کے نگاہیں ملا رہا ہے کوئی

جدید اُردو شاعری میں فراق گورکھپوری کے ہاں حسن کی نفسیات کی شاعرانہ پیش کش ہوئی ہے۔ جدید شاعری نے فراق کے بعض اثرات قبول کئے ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد میں متعدد شعراء کو براہِ راست متاثر کیا۔ قابل کے ہاں بھی فراق کے گہرے اثرات

نظر آتے ہیں۔ خصوصاً حسن کی نفسیاتی کیفیت کو سمجھنے میں وہ فراق کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ تاہم اس ضمن میں اپنی انفرادیت بھی قائم رکھتے ہیں، فراق کا ایک شعر دیکھئے:

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست!
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

قابل وصال سے قبل کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

جمالِ دوست کو پیہم نکھرنا ہے، سنورنا ہے
محبت نے اُٹھایا ہے ابھی پردہ کہاں اپنا

یاد..... فسانۂ عشق کے ایک اہم باب کا عنوان ہے۔ ہجر وفراق کے اُداس لمحوں میں تصورِ جاناں عاشق کے لئے غم گسار بھی ہوسکتا ہے اور باعثِ آزار بھی۔ کسی کی یاد مہربان بھی ہوسکتی ہے اور بے رحم بھی۔ قابل اجمیری کے ہاں یاد آفرینی کے حوالہ سے دونوں ممکن صورتیں نظر آتی ہیں۔ تاہم وہ رجائی اور نشاطیہ پہلو کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ وہ محبوب کی یاد کو مسیحا قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی کی یاد چاندنی کی طرح نرم، پھول کی مانند رنگیں اور ساغر کی طرح کیف آور ہے۔ یاد..... قابل کی غزل کا ایک اہم موضوع ہے۔ ان کے کلام میں ایک مکمل غزل ''تیری یاد'' کی ردیف میں ملتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک غزل ''تو یاد ہوں گے'' کی ردیف میں بھی پائی جاتی ہے۔ ذیل میں اس حوالے سے چند شعر دیئے جارہے ہیں:

دل کی وادی میں چاندنی کی طرح
پھیلتی جارہی ہے تیری یاد

تمہیں بھی آغازِ دوستی کے حسین نظارے تو یاد ہوں گے
جو اپنی الفت کے رازداں تھے وہ چاند تارے تو یاد ہوں گے

زندگی اتنی دلفریب نہ تھی
تم مگر مجھ کو یاد آتے رہے

''یاد'' کی متنوع صورتیں ملاحظہ ہوں:

تمہاری یاد کو آرامِ جاں بنایا تھا
تمہاری یاد بھی لیکن کبھی کبھی آئی
ہوا تھا ہجر کا احساس لمحہ بھر کے لئے
پھر اس کے بعد تری یاد عمر بھر آئی

مجھے تو اس درجہ وقتِ رخصت سکوں کی تلقین کررہے ہو
مگر کچھ اپنے لیے بھی سوچا، میں یاد آیا تو کیا کرو گے؟

تضاد..... شاعری کی ایک خصوصیت ہے۔ یہ تضاد کبھی کیفیات و جذبات کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے اور کبھی الفاظ و تراکیب میں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ قابل کے کلام کا ایک وصف یہی ''تضاد'' ہے۔ غیاث الدین قریشی کے بقول:

''قابل کی شاعری کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کے اشعار میں متضاد الفاظ، متضاد کیفیات اور متضاد جذبات کا نہایت مؤثر اور دلفریب استعمال نظر آتا ہے''۔(8)

قابل کے ہاں ''تضاد جذبات'' کی نازک کیفیات کی صورتیں دلکش اسلوب میں بیان ہوئی ہیں۔ خصوصاً جب وہ رونے اور ہنسنے کی متضاد کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہیں تو ان کی ہنرمندی عروج پر نظر آتی ہے۔ نقاد سحر انصاری اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''قابل کی شاعری میں شعلہ و شبنم بلکہ شبنم و طوفان کی سی متضاد کیفیات بھی ملتی ہیں''۔(9)

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قابل کی آنکھوں میں آنسوؤں کی سوغاتیں ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ ہونٹوں پہ مسکراہٹوں کے خزانے بھی موجود ہیں۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تضادِ جذبات میں یہ نازک مقام آیا تو کیا کرو گے
میں رو رہا ہوں تو ہنس رہے ہو میں مسکرایا تو کیا کرو گے

ان کی پلکوں پر ستارے، اپنے ہونٹوں پر ہنسی
قصۂ غم کہتے کہتے ہم کہاں تک آگئے

ہونٹوں پہ ہنسی، آنکھ میں تاروں کی لڑی ہے
وحشت بڑے دلچسپ دوراہے پہ کھڑی ہے

اس آخری شعر کو پڑھ کر غالب کی یاد آتی ہے:

شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ ہاں
دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

قابل اجمیری ''وقت'' کو بھی عشق کے آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں اس حوالے سے رومانوی نقطہ نظر ملتا ہے۔ ان کے ہاں وقت گزرنے کا احساس نمایاں ہے، لیکن یہ احساس کسی کرب یا زیاں سے عبارت نہیں۔ ان کے خیال میں ہجر کی رات ہو یا صبح نشاط، وقت بہرحال اپنی خاص رفتار سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔

کٹ گئے، ہجر کے پہاڑ سے دِن
وقت کو تیرا انتظار نہ تھا

وقت کے زخم سل بھی جاتے ہیں
عمرِ رفتہ پلٹ بھی آتی ہے

جبینِ وقت کو ہم نے بھی نور بخشا ہے
سلیقۂ نگہ یار ہم بھی رکھتے ہیں

قابل وقت کی جبریت کے خلاف نبرد آزما بھی ہوتے ہیں اور اس پیکار میں یقینِ

محکم اور عملِ پیہم کو بروئے کار لاتے ہیں۔

کر رہا ہوں جہادِ زندگی
وقت میری داستاں ہے آج کل

ہم چراغِ یقیں جلاتے رہے
وقت کو راستہ دکھاتے رہے

قابل سلسلۂ روز و شب میں جو حادثات پیش آتے ہیں، انہیں ایک مفکر کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

یہاں یہ بات پیش نظر رکھنا ہوگی کہ قابل کی شاعری صرف فسانۂ حسن و عشق کا بیان نہیں۔ وہ غزل کے اس محبوب موضوع سے گریز کرتے ہوئے زندگی کی دیگر صورتوں اور حالتوں کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں۔ انہیں یہ احساس تھا کہ زمانے میں محبت کے سوا اور بھی کئی طرح کے دُکھ ہیں جنہیں شعر کے پردے میں بیان کیا جاسکتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قابل کے پاس موضوعات کا فقدان نہیں ہے۔ وہ غزل میں محدودیت کے قائل نہیں اس لیے ہمیں ان کی شاعری میں وسعت اور کشادگی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے کلام میں ناقدریٔ عالم کی شکایت بھی ہے اور فریبِ دوستاں کا احوال بھی، وہ میکدے کی داستان بھی بیان کرتے ہیں اور گردشِ دوراں کی کہانی بھی سناتے ہیں، ان کے یہاں غمِ روزگار کا تذکرہ بھی ہے اور عصری آگہی کا بیان بھی۔ یہ وہ مضامین ہیں جن سے قابل کی غزل کا دامن آباد ہے۔ آخر میں ایک طویل بیماری سے نبرد آزما ہونے والے شاعر کا ایک معنی خیز شعر ملاحظہ ہو:

جیسے ہم جان ہی نہیں رکھتے
موت کا اجتناب تو دیکھو

✿ ✿ ✿

حواشی

1- آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، آزاد کشمیر: ارسلان بکس، ص 200

2- فرمان فتح پوری، ''غزل میں تجدد کی ایک مثال'' طالب علم ڈائجسٹ (قابل نمبر:2) (حیدرآباد: طالب علم ڈائجسٹ مطبوعات، فروری 1970ء) ص 28

3- عبادت بریلوی، طالب علم ڈائجسٹ،ص 17

4- ساجد امجد، ڈاکٹر ماہنامہ ''سرگزشت'' (کراچی، اکتوبر 1992ء) ص 74

5- بینش سلیمی، ''قابل اجمیری'' نئی قدریں (اُردو شاعری نمبر) 1967ء،ص 553

6- فرمان فتح پوری، طالب علم ڈائجسٹ ،ص26

7- سحر انصاری، ''شاعرِ اعتماد قابل اجمیری'ہفت روزہ ''فکر وعمل'' (حیدرآباد، 30 ستمبر 1977ء) ص 6

8- غیاث الدین قریشی، ''قابل کے رنگِ سخن کا ایک پہلو'' طالب علم ڈائجسٹ،ص 57

9- سحر انصاری،ہفت روزہ ''فکر وعمل'' ص5